باب ٦

نافۂ ذات

حقیقت کیا ہے؟

حقیقت کیا ہے؟ یہ جو ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ پسِ پردہ کچھ ہے۔ وہ جو کچھ ہے حقیقت ہے۔ پس پردہ کیا ہے اس کا انکشاف جس حد تک فنا حاصل کرتا جائے ہوتا جاتا ہے۔ اول یہ فنا شعور کی سطح ہے۔ ایک ایک چیز کی لا کرتے جائیں، جو فنا ہونے والی شے ہے اس کو بقا کہاں۔ حق جو حیّ وقیوم ہے اس تک پہنچ فانی چیزوں کے ذریعہ کہاں ہو سکتی ہے۔ شعور کے بعد لاشعور ہے۔ جو خود حقیقت کا حجاب ہے۔ لاشعور کی دسترس سے بھی نکلنا ہے۔ عقل و دانش کے بل بوتے یا مجاہدوں ریاضتوں کے سہارے اس سے نجات پالینا ممکن نہیں۔ عشق ہی میں وہ صلاحیت ہے کہ لاشعور ہی کیا اس سے آگے ان جبلتوں سے بھی فنائیت عطا کرتا ہے جس کی جڑیں انسان کے خون میں کروڑوں سال پرانی ہیں۔ پھر ان جبلتوں سے اوپر اٹھنے کے بعد مقامِ روح ہے جہاں بصیرت حاصل ہوتی ہے اور زمان سے آزادی ملتی ہے۔ اس کے بعد ہی کہیں واقعات کا رخ اور اسی قسم کی چیزیں صحیح انداز میں آشکار ہوتی ہیں۔ روح کی منازل پر پہنچ کر حقیقت آشکار تو ہو جاتی ہے مگر رسائی کیسے ہو؟

روح کی منزل پر انفرادی روح ہے۔ اس کا ادراک اس وجود میں رہتے ہوئے ہو جائے تو شعور، لاشعور اور جبلتوں کی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ چکے

ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت کی طرف ایک ابتدائی قدم ہی ہے۔ جب انفرادی روح کا ادراک بڑھتے بڑھتے روحِ کلّی کا اِدراک حاصل ہوتا ہے، تو اور پردے اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب یہ ادراک اپنا ہو جائے، قیام نصیب ہو، قطرے کو بحرِ حقیقت کی وسعت نصیب ہو، تو غیب کے پردے اٹھنے شروع ہوتے ہیں، مگر وہ جو ستر ہزار پردوں میں ہے اس تک رسائی پھر بھی کیسے ہو۔ یہ خیال وفہم وشعور و لاشعور کی بات نہیں۔ یہ تو ایک واردات اور تجربے کی بات ہے جس کا بیان الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔ یہ اسی کے نصیب میں ہے جس کی اس راہ سے گذر ہو۔ یہ عقل وفہم اور نفس و قلب کی منازل سے اوپر کی بات ہے اور یہ تجربہ ہونے میں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہے۔ انجام ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' ہی ہے، اس عرفانِ حقیقت کا لیکن پھر بھی تشنگی ہے۔ تجسس اور تڑپ کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ جان جان کو کیسے دیکھے، کیسے اس تک رسائی ہو، مولانا روم نے بھی فرمایا۔

لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

اس دیکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے حضوری

عشق کی تجلی 'مَیں' کی تجلی اور رحمت کی تجلی میں جمالِ حسن کا اکمل پیکر لیں تو ایسا جلوہ ہوتا ہے کہ نہ جلوہ کا ہوش نہ اپنا۔ یہی تو اپنی حقیقت کو دیکھ لینا ہے۔ ہم جو کسی حسین کی طرف رجوع ہوتے ہیں وہ اپنی ہی طرف سے ہوتے ہیں۔ معشوق میں دراصل اپنے کو دیکھتے ہیں۔ معشوق آئینہ ہوتا ہے۔ پھر جب حسین کا سب حسن سلب کرکے دیکھتا ہے تو مازاغ البصر آنکھوں کی ٹھنڈک۔ حسین کو بھی یہ لطف کہاں مل سکتا ہے جو دیکھنے والے کو ملتا ہے۔ یہ

کیفیتِ حضوری عقل ونفس وشعورو لاشعور کو گم کر کے حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ تصور آنکھوں میں جم جائے تو اس کیفیت میں قیام عطا ہوتا ہے۔ اپنی فنا محبوب میں بقا۔ پھر جب یہ انداز ہو کہ ؎

عشقِ مجنوں نیست ایں کارِ من است
حسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

جب عشق بھی وہی، حسن بھی وہی، دیکھنے والا بھی وہی، دیکھنے کی چیز بھی وہی، تو گویا اپنے نے اپنے کو دیکھا۔ جب ''رَاَیتُ رَبِّیْ بِرَبِّی'' کا انداز ہو کر ہوش آئے، تب اپنے غیب کے کھلنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رویتِ حقیقتِ محمدیؐ کا ظل تھی جس کے ذریعہ تم نے اپنی حقیقت کو دیکھ لیا اور جیسے ہی شعور و فہم کے ذریعہ اس حقیقت کو دیکھنا چاہا، تعینات کے پردے پڑ گئے۔ اپنی کوشش اپنے تخیل اپنے وجود سے علیحدہ ہو کر ہی یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ یہ باطن کی راہ ہے۔ باطن کی راہ کھلنے کے لئے محبت کا دوام ضروری ہے۔

جسمانی اور مادی محبت عمر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ عشق کو دوام اس وقت ملتا ہے جب مر کر حسن کو دوام ہو۔ یہ حقیقتِ محمدیؐ ہے جس کی ضیاء ہر حسن کے روپ میں ہے۔ لا وجود سے عشق کیا۔ منتہائے لطافتِ زمان مکان سے جب عشق نہیں کر سکتے تو ''اَلطف در اَلطف'' سے عشق کے کیا معنی؟ تم وجود میں ہو اس لئے مظہرِ کامل سے زیادہ اکملیت کے انداز میں اس حقیقت کو کہاں پاؤ گے۔ شیخ ہی آئینہ ہے اس حقیقتِ محمدیؐ کا حق ایک ہی ہے۔ تمہاری حقیقت، شیخ کی حقیقت، رسول کی حقیقت ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہے۔ یہ نسبت کی بات ہے اس توحید کو اپناؤ اس کا کیف لو۔

اسی حُسن کی تابنا کی میں مومن کی زندگی اپنے محبوب کے لئے پائیدار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ رحمت کی طلب میں خود رحمت بن جاتا ہے۔ کسی اعلیٰ کے عشق میں نُور علیٰ نُور بن جاتا ہے۔ اس رحمت کو اپنے غیب میں پاتا ہے۔ اپنے وجود کو بھول کر محبوب کے لئے جی رہا ہوتا ہے۔ اپنے غیب میں محبوب بسا ہوتا ہے جو حقیقت ہے جس کو دوام ہے۔ اب اس جسم کے ٹکڑے کر دو مگر اس محبوب سے علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ محبوب جان ہی میں تو ہے۔ یہ اپنے اختیار کی بات کب تھی۔ اسی نے اپنے کو چاہا۔

یہ عشق کی بات ہے، زندگی کے شعلے کی بات ہے۔ عشق کے لئے صداقت چاہیے لگاؤ چاہیے، دیوانگی چاہیے، استقامت چاہیے، بھروسہ چاہیے ایمان چاہیے۔ یہ نازک بات ضرور ہے مگر اپنے بس کی بات بھی نہیں۔ صلاحیت کی بات ہے، مقدر کی بھی اور کرم کی بھی۔ عشق کی بات لاشعور میں بتی جل جانے کی بات ہے۔ روح کے مقام پر اٹھا لئے جانے کی بات ہے۔ جب اٹھا لیا گیا تو مقامِ جبروت حاصل ہوا۔ محبوب نے نواز لیا۔ اَنا رُوحی کی کیفیت نصیب ہوئی۔ روح کا ادراک ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ میں اس جسم کو لئے پھر رہا ہوں۔ کوئی اور 'مَیں' اس جسم کو سنبھالے ہوئے ہے۔

یہ انا روحی والی 'مَیں' ہے جس کو قیام ہے۔ یہ 'مَیں' کی تجلی ہے۔ یہ رحمت کی تجلی ہے جسے رحمتِ عالم کہتے ہیں۔ یہی 'مَیں' میرے غیب میں ہے اسی لئے ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ'' کہا گیا اسی لئے ایمان بالغیب اسلام کا بنیادی پہلو قرار دیا گیا۔ پاک، متقی عاشق لوگوں کی نشانی ایمان بالغیب بتائی گئی۔ اس غیب کا کھلنا فتح الغیب ہے۔ فتح کھلنا ہے، بندگی کا پردہ اٹھنا ہے جسے دیکھا ہے سنا ہے وہ غائب نہیں۔ غیب وہ ہے جس پر یقین ہو کہ ہے، اور سب سے زیادہ

یقین جس پر ہو سکتا ہے کہ ہے، وہ اپنی 'مَیں' ہے۔ کائنات کی ہر شے خواہ دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو اس پر گمان ہو سکتا ہے کہ ہے یا نہیں مگر جس پر یقین ہے کہ ہے وہ اپنی 'مَیں' ہے۔ ایمان اگر مکمل طور پر ہے تو اسی 'مَیں' پر ہے جو غیب میں ہے۔ یہ ایمان اتنا ٹھوس ہے کہ ہر شخص اسی کے بل بوتہ پر زندگی گذارتا ہے۔

اس طرح عرفانِ ذات کا راستہ اپنے ہی اندر ہے۔ اپنی حقیقت تک پہنچ کر ہی ذات تک رسائی ہو سکتی ہے۔ البتہ ذات کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک زمان مکان سے نجات نہ ملے۔ جب تک وجود کے حبس سے رہائی جیتے جی نہ ہو یعنی جب تک بصیرتِ روح حاصل نہ ہو۔ جب اپنا آئینہ صاف ہو گیا، اس وجود کی لا ہو گئی، عقل و نفس و حواس کے پھندوں سے نجات ملی، اپنی فنا حاصل ہو گئی، محبوب میں بقا ملی۔ حقیقتوں کی نقاب کشائی اپنے آئینہ میں ہو گئی۔ بصیرتِ روح حاصل ہو گئی تو پھر خیال امر سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خیال روح کی جڑوں تک حتیٰ کہ ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' تک ہوتا ہے۔ یہ ایقان ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کی تجلی اپنے ہی اندر ہے۔ یہ ''ھُوَ اللہُ اَحَد'' اپنے اندر انکشاف ہے۔ توحید کی نشاندہی اللہ میں ہے مگر اس کی تصدیق ھُوَ اللہ میں ہے۔

جسے اللہ ذات کہتے ہیں وہ ہر شے کا باطن در باطن ہے۔ اس کی اجمالیت ہر فرد کے باطن میں ہے اور یہ اپنی 'مَیں' کے سوا کچھ نہیں اس 'مَیں' کا عرفان ہی ''عرفَ نَفْسَہٗ'' ہے۔ اپنی جان جان کو کیسے دیکھے، اس لئے اس کی بصیرت ھُو اللہ میں ہے۔ کسی آئینہ میں اس تجلی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آئینہ شیخ کی ذات ہے اور جب اپنا آئینہ بھی مجلّٰی ہو جائے تو اب اس 'مَیں' کے

آئینہ میں ہی تجلی ذات ہے۔ یہ حقیقتِ محمدیؐ ہے جو مظہرِ کل عجائب غرائب ہے۔ جو "نُورٌ علیٰ نُورٌ" ہے۔

ان انوارِ ذات کے آگے، اس ہونے کے آگے نہ خیال ہے، نہ امر۔ اس کے آگے بس 'ہے' ہی ہے۔ اس 'ہے' کے شعور کو عرفانِ ذات کہہ لو۔ ذات بے نام و نشان ہے، اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'ہے' کی واردات کائنات اور خالقِ کائنات کے ساتھ یکتائیت وجود ہے کہ نہ 'مَیں' رہا، نہ تو رہا نہ عشق رہا۔ بس ھُو ہی ھُو۔ اس ھُو میں کھو جاتا ہے۔ نہ اپنی خبر نہ تیری خبر، نہ خبر کی خبر ؎

خبرِ تحیّرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو مَیں رہا جو رہی تو بے خبری رہی

سرمستیٔ وحدت الوجود

یہ مقامِ تحیر عشق ہے۔ اس کے بعد جب آگہی نصیب ہوئی 'ہے' کی واردات اپنے آئینہ شہود میں پالی۔ اب وحدت الوجود میں حق آگہی ہوئی تو اپنے نے اپنے کو پایا۔ اسی لئے بے خبری نے کہا ھو میں کھو جانا ہے اور خبر پکار اٹھی 'ہے' میں پا جانا ہے۔ مگر کیا کھویا کیا پایا۔ اس نے کب ساتھ چھوڑا تھا، جو کھویا اور کب نہ تھا جو پایا۔ نہ کھویا نہ پایا۔ حق جو ازل سے تھا جو ابد تک ہے وہ بس ہے، اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ جیسے کا تیسا۔ نہ کمی ہوئی نہ بیشی ہوئی۔ البتہ حقیقت کا تعلق عالمِ خلق تک تھا جب عالمِ خلق سے ماوراء ہوئے، سب کچھ کھویا تو حق ہی حق ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ذات کا بیان کس طرح ہو۔ یہ عالمِ خلق سے اوپر کی بات ہے۔ اسے واردات ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں نہ ادراک ہے نہ وجدان، نہ تجلی نہ حق آ گہی، بس 'ہے' ہی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے سب کچھ پیچھے چھوڑ دیا، سب کچھ کھویا کیسی عقل، شعور، لاشعور، کیسا نفس، قلب، روح، روحِ اعظم، کیسا ناسُوت، ملکُوت، جبرُوت، ھاھُوت، لاھُوت، کیسا ایمان، ایقان، کیسا عشق، وجدان، کیسی توحید، کیسا ترکِ ترک۔ سب کچھ کھویا سو پایا۔ جس نے اپنا سب کچھ فنا کیا اسے بقا ملی۔ ماسوائے ذات کو فنا کر کے ذات میں بقا ملی۔ جو کھویا سو پایا۔ اور جیسے ہی پانے کا ہوش آیا سب کچھ کھو بیٹھے۔ اس ہوش، اس وجود نے پھر تنزلات کے چکر میں ڈالا۔ اس لئے جو پایا سو کھویا۔ مگر جو دوام ہے۔ جو ہے، اور بس ہے،۔

اس لئے کیا پایا کیا کھویا۔ نہ پایا نہ کھویا۔ ایک سرودِ ازلی، ایک مئے اَلستی، ایک کیف و سرور، ذات کی بھینی بھینی خوشبو۔ سرمستی پکار اٹھی ہا ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا غیریت کی کب گنجائش کہاں ہے ہے ہے ہے میں بھی دوئی تھی، غیریت کی بو آتی تھی۔ ہا ہا ہا ہا کا سرودِ ازلی ابدی دائی ہے۔ ایسی یکتائیت میں ہے جسے توحید کا نچوڑ، توحید کا اہتمام کہہ لیں۔ یہی تو اجمالی صورت میں "سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ" کا انداز لئے تھا اور "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَان" کی شان بنا تھا۔ فنا در فنا سب کچھ موجودات و اسماء و صفات کے بعد یہی تو باقی رہنے والی بات تھی۔ یہی تو

من زجاں فانی بہ جاناں باقیم

کی معراج تھی۔ یہی "یَبْقٰی وُجْهُ رَبِّکَ" کا اتمامِ احسان تھا انسان پر۔ اسی

کے لئے فرمایا تھا کہ ہماری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' انعام و اکرام تو دیکھو کہ اپنی صورت پر بنا کر وجود دیا، جان دی، اختیار دیا۔ نفس، عقل، قلب، وجدان عطا کیا۔ پھر جانِ جان سے نوازا، اپنی روح پھونکی، سب کچھ اسماء وصفات سے نواز کر ملائک کے سامنے پیش کر دیا اور انداز احسان تو دیکھو کہ اسماء و صفات پر ہی بس نہیں کہ بلکہ خود پس پردہ رہ کر ہمیں سامنے کر دیا۔ اتمام صفات و ذات بھی اس پیرایہ میں کر دیا کہ خود ہی اس وجود میں سما بیٹھے۔ پھر گم گشتہ آرزو کو اپنی تلاش اور تجسس میں لگا دیا۔ ساتھ ہی فِی ''اَنْفُسِکُمْ نَحْنُ اَقْرَبُ، ھُوَ مَعَکُمْ'' فرما کر ذات کے پردے بھی چاک کر دیئے۔ جب اس متلاشی حق کو راہ ملی، اپنے عروج کی منازل کی طرف بڑھا تو ھُو میں دوام عطا کیا۔ 'ہے' میں قیام یہ دوام و قیام وحدت الوجود کے کیف کی بات تھی۔ ھُو میں گم گشتگی تھی، مستی ہی مستی، نہ ساقی کا پتہ نہ اپنا۔ یہ دائم کیفیت زمان سے ماوراء تھی۔ ذات کی تجلی میں گم شدنی تھی ایک سرودِ ازلی، ایک کیفِ کُن، ایک مقامِ حیرت، ھُو کا ایک جذبِ دوام۔

گم شُد اندر گم شُد اندر گم شُدان

وحدتُ الوجود کے کیف میں ابھی تشنگی باقی تھی۔ سرِ بازاری رقصم والی بات نہ تھی۔ پھر جو ہوش آیا کہ 'ہے' اپنے وجود اور وجودِ کل کی دو آتشہ ملی۔ جامِ سرمستی میں اور طوفان آیا۔

بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست
چرخ در گردش اسیر ہوشِ ماست

اس سرمستی میں تمام کیف و سرور سے مبّرا ہو کر، اسماء و صفات سے

پاک ہو کر ''وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ'' کے انداز میں ذاتِ بے گراں کی لطافتوں کو اپنانا۔ اس کا تعلق نہ زمان سے ہے نہ مکان سے۔ بس 'ہے' جس میں قیام ہے۔ اس ذات کو سمونے والے کا ھُو میں دوام ہے۔ 'ہے' میں قیام ہے۔ وہ زمان و مکان کی قیدوں سے آزاد ہے۔ اس کے لئے نہ ھُو زمانی ہے، نہ 'ہے' مکانی ہے۔ پھر بھی اس خمارِ اَلَست میں اتنا ہوش تو ہے کہ تُو تُو ہے مَیں مَیں ہوں۔ لیکن نمی دانم چرا رقصم کی مستی میں اس کا یہ حال ہے کہ نہ تُو ہے نہ مَیں ہوں۔

بہ ایں اندازِ یکتائی بہ جاناں جانِ من رقصم

یہ وصال ذات ہے، نہ سرمستی، نہ آگہی۔ ان زنجیروں سے بھی آزادی ان لطافتوں سے بھی الطف۔ اس حسن و لطافت کی قید سے آزادی میں ھُو کا سرود ازلی نغمہء لاہوتی الاپ رہا ہے۔ 'ہے' کا کیفِ ھاہوتی مستیء الست بنا خود مئے الست کا جوش بنا ہے۔

ہاہاہاہا------ہاہاہاہا

ارغنونِ ذات کے سرودِ سرمدی کی عدم کے ناقوس سے بازگشت گونج رہی ہے۔

پس عدم گردم عدم چُوں ارغنوں
گویدم کانا اِلَیہِ رَاجِعُوں

کُنْتُ کَنزاً مخفیً چکا۔ ہاہاہا۔ اہو، ہو ہو
فَاَحْبَبْتُ سے جب اچھلا۔ ہاہاہا۔ اہو، ہو ہو
خَلَقْتُ الخلق میں ٹھہرا۔ ہاہاہا۔ اہو، ہو ہو
تو یارو ہم نے کیا دیکھا۔ ہاہاہا۔ اہو، ہو ہو